اسلامی عدالتی نظام میں عادلانہ حق سماعت کی اصطلاح کا مفہوم

A Research Review of Right to Fair Trial in Islamic Judicial System

مقالہ نگار: ڈاکٹر عائشہ جدون

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی وعلوم اسلامیہ، وومن یونیورسٹی صوابی
a_jadoon82@yahoo.com

معاون مقالہ نگاران: ڈاکٹر عمر سلیم

اسسٹنٹ پروفیسر، غلام اسحاق خان انسٹیٹیوٹ، ٹوپی
oumarsaleem@yahoo.com

ڈاکٹر محمد سہیل

اسسٹنٹ پروفیسر، اقراء نیشنل یونیورسٹی، پشاور
drsohail@inu.edu.pk

Abstract

The term "Fair Trial" has become very important in modern times and is one of the basic rights of the accused. There is no comprehensive definition of this term, but there are details in the international documents on the guarantees that come as a result of this right. These include the Universal Declaration of Human Rights 1948, the International Covenant on Civil and Political Rights, and many other human rights Instruments. The 18th Amendment to the Constitution of Pakistan also makes the right to a fair trial a part of the Constitution. This right includes appointing a judge, giving the accused a chance to defend himself, the right to testify the witnesses, appealing against the verdict and some other matters are also included in the guarantees of this right. This term is not used in the Islamic judicial system, but Islamic teachings are very clear about the guarantees obtained as a result of this right and Islam clearly distinguishes between the accused and the guilty. Justice has always been given priority in the period from the time of Prophet hood to later times and history has preserved many incidents which are clear evidence of this right in the judicial system. This article appraise the Research Review of Right to Fair Trial in Islamic Judicial System.

Keywords: Fair, Trial, Islamic Judicial system, accused, ICCPR

تعارف:

عادلانہ حق سماعت کی اصطلاح معاصر دور میں نہایت اہمیت اختیار کر چکی ہے اور ملزم کے بنیادی حقوق میں شامل ہے۔اس اصطلاح کی کوئی جامع مانع تعریف تو موجود نہیں البتہ اس حق کے نتیجے میں ملنے والی ضمانتوں کی بابت بین الا قوامی مواثیق میں تفصیلات موجود ہیں۔ جن میں عالمگیر اعلامیہ برائے انسانی حقوق ۱۹۴۸، بین الا قوامی میثاق برائے سیاسی و شہری حقوق ۱۹۶۶ اور دیگر انسانی حقوق کے

دستاویزات شامل ہیں۔ پاکستان کے آئین میں بھی اٹھارویں ترمیم کے ذریعے منصفانہ حق سماعت کو آئین کا حصہ بنایا گیا ہے۔اس کی ضمانتوں میں اعلانیہ سماعت، ملزم کو اس کے جرم کی بابت باخبر کرنا، مترجم کی سہولت فراہم کرنا، کسی خاص مقدمے میں خاص قاضی یا جج کو مقرر کرنا، ملزم کو دفاع کا موقع دینا، گواہوں کی جانچ کا حق دینا، فیصلے کے خلاف اپیل کرنا اور کچھ دیگر امور بھی شامل ہیں۔

اسلامی عدالتی نظام میں یہ اصطلاح اس طرح تو رائج نہیں البتہ اس حق کے نتیجے میں حاصل ہونے والی ضمانتوں کی بابت اسلامی تعلیمات واضح طور پر ملزم اور مجرم کے درمیان فرق ملحوظ رکھتا ہے۔ عہد نبوت سے لے کر بعد تک کے ادوار میں عدل کو ہمیشہ مقدم رکھا گیا ہے اور تاریخ نے ایسے کئی واقعات محفوظ کیے ہیں جو عدالتی نظام میں اس حق کو پیش نظر رکھنے کی واضح دلیل ہیں۔

عہد نبوت کے عدالتی نظام میں عادلانہ حق سماعت کا مفہوم

قبل از بعثت جزیرہ عرب کا عدالتی نظام

قبل از بعثت نبوی مکہ مکرمہ میں نظام قضاء میں دور جاہلیت کے چند رسم و رواج اور عرف کو برقرار رکھا گیا۔ جیسے 'قسامہ[1]'' کا مسئلہ تھا۔ اسلام نے زمانہ جاہلیت کے بعض رائج احکامات میں ترامیم و تبدیلی کے بعد انہیں معتدل بنا دیا تھا۔ جیسے نکاح، طلاق، مہر و غیرہ کے معاملات اور بعض رائج امور کو لغو قرار دیا جیسے متبنیٰ کا مسئلہ[2] اسی طرح بیع کی چند صورتوں کو بھی لغو قرار دے دیا جیسے منابذہ[3]، ملامسہ[4] کو لغو قرار دیا گیا۔[5] جبکہ مدینہ منورہ میں اسلام سے قبل عدالتی نظام دیگر شہروں کی نسبت قدرے بہتر تھا جس کی بنیادی وجہ ان کا یہود کے ساتھ اختلاط تھا اور بالعموم اہل مدینہ یہودی قانون کی ہی پیروی کرتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں کاہنوں کو بھی کافی اہمیت حاصل تھی[6]۔ کاہن بعض اوقات فریقین کا مقدمہ سننے سے پہلے ہی درست فیصلہ صادر کر دیتے تھے۔ اگرچہ کاہنوں کے فیصلوں پر عملدرآمد سرکاری طور پر تو نہیں ہوتا تھا لیکن لوگوں کو ان پر اس حد تک یقین اور اعتماد ہوتا کہ وہ بخوشی ان کے فیصلوں کو تسلیم کرتے تھے۔ لیکن ''حکم'' کے فیصلوں کو اس درجہ عقیدت سے نہیں لیا جاتا تھا اور بعض اوقات فریقین اس کے دیے گئے فیصلہ پر اعتراض بھی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حلف الفضول مکہ مکرمہ میں ایک قسم کا سماجی ادارہ تھا اگرچہ اس کا آغاز تو قبیلہ جرہم کے مکہ میں آبادکاری کے ساتھ ہو گیا تھا لیکن حرب الفجار کے بعد یہ فعال ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ بھی اس سماجی معاہدے کا حصہ تھے۔ یہ رضاکاروں پر مشتمل جماعت تھی جن کے مقاصد یہ تھے کہ مظلوم کی امداد کی جائے اور ظالم کو سزا دی جائے۔[7]

یثرب کا عدالتی نظام

یثرب میں یہود کا عدالتی نظام مکہ کی بنسبت منظم تھا۔ ان کے عدالتی نظام کو شاہ فرانس نپولین نے 1807 میں دوبارہ رائج کرنے کی کوشش کی۔ اس نظام میں مرکزی عدالت عالیہ تھی جس کا نام سنھدرین Sanhedrin تھا۔ یہودی روایت کے مطابق یہ نظریاتی عدالت تھی۔ تقریباً 70ء تک یہ عدالت عالیہ کے فرائض سر انجام دیتی رہی، بعد ازاں سیاسی اختیارات کے واپس لیے جانے پر اس کا دائرہ کار (jurisdiction) صرف شہری اور مذہبی قوانین تک محدود ہو گیا۔ اس کے ممبران کی تعداد زیادہ ہوتی تھی جو مختلف بورڈ کی شکل میں مختلف تنازعات کا فیصلہ کرتے۔ رومی عہد حکومت میں یہود کی اس عدالت کے اراکین 71 تھے۔ یہ عدالت فوجداری

اور سول مقدمات و معاملات کے تصفیہ کے لیے تھی۔ یہود کا سب سے بڑا مذہبی راہنما اس عدالت کا چیئر مین ہوتا اور قانون کی جو تعبیر و تشریح یہ چیئر مین کرتا وہ سب کے لیے قابل قبول ہوتا۔ مذہبی رسومات کی پابندی کروانا اور کلینڈر کے مطابق تاریخوں کی تعیین اس کے مشورے سے طے ہوتی۔ اور تقریباً پانچویں صدی عیسوی تک فلسطین میں اس عدالت نے شان و شوکت سے اپنی ذمہ داری نبھائی[8]۔ جبکہ یونانی دور سے قبل ان یہودی عدالتوں کے بارے میں تفصیل نہیں ملتی کیونکہ یونانیوں کا اپنا منظم نظام رائج تھا۔ یہود کی سرکاری عدالت کے خاتمے کے بعد انہوں نے دیگر ممالک میں جو اپنا عدالتی نظام قائم کیا وہ اسی عدالت عالیہ کی طرز پر تھا اور اس نے ان ممالک کے عدالتی نظاموں پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے اس لیے مدینہ منورہ میں بھی ان کے عدالتی نظام نے اثر چھوڑا۔ دنیا کی پہلی تحریری دستور "میثاق مدینہ" میں یہ تصریح موجود ہے کہ اس معاہدہ میں شامل ہونے والے تمام لوگ اپنے نزاعات اور مقدمات میں رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کریں گے۔

عہد نبوی میں عدالتی نظام

رسول اللہ ﷺ کو اللہ رب العزت کی جانب سے عدل و انصاف کے التزام کا حکم تھا[9]۔ اور آپ اسی کے مطابق تنازعات کا فیصلہ فرماتے تھے اور اپنے تعینات کردہ عاملوں سے بھی اسی کا تقاضا فرماتے تھے[10]۔ آپ ﷺ کے سامنے جو مسئلہ پیش کیا جاتا آپ ﷺ اس کی چھان بین کے بعد بلاتاخیر فیصلہ فرمادیتے تھے جب کہ دیگر علاقوں میں آپ ﷺ کی طرف سے جو گورنر بھیجے جاتے وہ تنازعات کا تصفیہ کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو آپ ﷺ اس کی تفتیش فرماتے اور بوقت ضرورت ملزم کو تفتیش و تحقیق کے لیے قید بھی کرتے تھے۔[11] اسی طرح فوجداری مقدمات کے ملزموں کو تحقیق و تفتیش تک اور مدیون کو قرضے کی ادائیگی تک قید میں رکھتے تھے۔[12] آپ ﷺ اس بات کا لتزام فرماتے تھے کہ محض تہمت کی وجہ سے کسی کا بھی مواخذہ نہ کیا جائے جب تک ثبوت نہ مل جائے۔[13] آپ ﷺ کے مبارک دور میں اپیلٹ کورٹ کا تصور بھی موجود تھا۔ آپ ﷺ کے متعین کردہ عاملین کے فیصلوں سے اگر لوگوں کو شرح صدر نہ ہوتا تو وہ آپ کے پاس بھی اپیل کر سکتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مقدمے کا فیصلہ کیا اور فریقین سے کہا کہ اگر ان کو اس فیصلے پر اطمینان نہ ہو تو وہ حج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کر سکتے ہیں۔ بعض لوگوں نے ان کے دیئے گئے فیصلے کو قبول کیا اور دیگر نے نہ مانا جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے وہ مسئلہ پیش کیا گیا تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دیئے گئے فیصلے کو ہی برقرار رکھا۔ گویا آپ ﷺ کے دور میں اپیل کا حق تھا۔[14] اور آپ ﷺ کی ذات سپریم کورٹ کا درجہ رکھتی تھی۔ آپ ﷺ کے دور کے نظام عدل کی بنیادی خصوصیات میں مساوات سر فہرست تھی۔ بسا اوقات آپ ﷺ اپنے آپ کو احتساب کے لیے پیش کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ مال غنیمت کی تقسیم کے دوران ایک شخص کو آپ ﷺ کا نیزہ چہرے پر لگا جو آپ کی طرف جھکا ہوا تھا آپ نے اس سے بدلہ لینے کو کہا مگر وہ راضی نہ ہوا۔[15] اسی طرح ایک مرتبہ ایک شخص لوگوں کو ہنسا رہا تھا آپ نے اس کی کمر پر مارا تو اس نے کہا میں اس کا بدلہ لوں گا آپ نے اپنی کمر اس کے

سامنے کی تو وہ کہنے لگا جب آپ نے مارا تھا میری کمر پر کپڑے نہیں تھے آپ نے اپنی قمیض ہٹائی تو اس نے مہر نبوت کا بوسہ لے کر کہا میں تو صرف یہ چاہتا تھا۔[16]

مبحث دوم: عہد خلافت راشدہ کے عدالتی نظام میں عادلانہ حق سماعت کا مفہوم

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جب ان کے سامنے کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا تو سب سے پہلے وہ کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتے اور پھر آپ ﷺ کے اقوال کی طرف اگر اس سے بھی جواب نہ ملتا تو صحابہ سے دریافت کرتے کہ فلاں مسئلہ کے بارے میں کسی کو رسول اللہ ﷺ کے عمل کے بارے میں معلوم ہو تو بتائے جب ایسا کوئی عمل نہ ملتا تو صحابہ میں سے اہل رائے کو جمع کرتے اور ان سے مشورہ کے بعد جس پر متفق ہوتے اس کے مطابق فیصلہ فرماتے تھے۔ زیادہ تر فیصلے تو وہ خود فرمادیتے لیکن جب خلافت کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں تو پھر قضاء کا شعبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ان ہی کی طرح قرآن وسنت سے مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرتے اگر ان میں نہ پاتے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے فیصلوں سے مدد لیتے اور اگر ان سے بھی فیصلہ نہ ملتا تو اصحاب الرائے کو جمع فرما کر مشورہ کرتے اور فیصلہ دے دیتے۔ سرکاری طور پر قاضی کا عہدہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شروع کیا۔ پہلے عدالتی کاروائیاں آپ خود سرانجام دیتے لیکن کثرت فتوحات سے انتظامی امور میں مشغولیت کی وجہ سے آپ نے قاضی مقرر کئے۔ اس دور میں مقدمات کا فیصلہ خلیفہ کی جانب سے مقرر کردہ قاضی کرتے تھے لیکن فوجداری مقدمات کا فیصلہ خلیفہ خود یا علاقے کے حکام سرانجام دیتے تھے۔ اسی طرح قید اور جرمانہ اور کوڑوں کی سزا بھی خلیفہ یا اس کا عامل دیتا تھا۔[17] قاضی یا تو براہ راست خلیفہ کے ماتحت ہوتا یا صوبہ کے حاکم کے ماتحت ہوتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں صفوان بن امیہ کا مکان چار سو درہم میں خرید کر جیل بنایا تھا۔ اور بالعموم خلیفہ خود قاضی کا انتخاب کرتا تھا۔ بعض اوقات صوبوں کے حکام کو بھی اس کا اختیار دیا جاتا۔ جیسا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے خط میں لکھا تھا۔ مدینہ منورہ میں آپ خود یہ ذمہ داری سرانجام دیتے تھے لیکن پھر آپ نے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا قاضی مقرر کر دیا۔ جب کوفہ وبصرہ آباد ہوئے تو حضرت شریح کو اس علاقے کا قاضی بنایا۔ اور انہوں نے ساٹھ سال تک اس عہدے پر کام کیا۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بصرہ کا قاضی بنایا گیا جب کہ مصر میں قیس بن ابی العاص سہمی کو یہ منصب سونپا گیا۔ یہ سب حضرات قضاء کے شعبہ سے وابستہ تھے۔ کتاب وسنت کے مطابق فیصلہ کرتے اور ان حضرات کے انتخاب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پوری چھان بین کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں عدلیہ کا کام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا تھا۔ اور ہر صوبہ میں مستقل قاضیوں کی تقرری کے سلسلہ کا آغاز ہوا۔ قضاء کی تفصیلات ہمیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خط میں ملتی ہیں جو انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو قضاء کے حوالے سے لکھا۔ علامہ ابن قیم نے اس خط کو بالتفصیل اپنی کتاب "اعلام الموقعین" میں نقل کیا ہے۔[18] جس کے مندرجات ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں۔

"قضاء ایک دینی فریضہ ہے جس کی بجاآوری سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق ضروری ہے۔ جب کوئی اپنا مقدمہ تمہارے سامنے پیش کرے تو غور وفکر سے اس کی بات کو سنو۔ فریقین کے دلائل سننے کے بعد جس فیصلہ پر پہنچو اس کو نافذ بھی کرو کیونکہ محض بول دینا کافی

نہیں جب تک عملی طور پر نفاذ نہ ہو۔لوگوں کے مابین مساوات برتو تاکہ کمزور اور نادار انصاف سے مایوس نہ ہو اور طاقتور تم سے کسی رعایت کی امید میں مبتلا نہ ہو جائے۔مدعی کے ذمہ ثبوت پیش کرنا ہے اور مدعیٰ علیہ کے ذمہ قسم۔مسلمانوں کے مابین حلال و حرام کی حدود کی رعایت کرتے ہوئے صلح کروانا جائز ہے۔جو شخص اپنے حق کے واجبات کے لیے کوئی فوری ثبوت مہیا نہیں کر سکتا اس کو مہلت دو۔اگر وہ مقررہ میعاد میں ثبوت پیش کر دے تو اس کے حق میں فیصلہ کرو ورنہ اس کے خلاف فیصلہ دو۔اگر فیصلہ کرنے کے بعد تدبر و تعمق سے تمہیں معلوم ہو جائے کہ پہلا فیصلہ درست نہیں تو بغیر کسی حیل و حجت کے اس سے رجوع کرو کیونکہ باطل پر ڈٹے رہنے کی نسبت حق کی جانب رجوع کرنا بہتر عمل ہے۔تمام مسلمان قابل اعتماد ہیں ماسوا ان لوگوں کے جن کو حد کی مد میں کوڑے لگے ہوں یا جنہوں نے جھوٹی گواہی دی ہو یا جن کے نسب میں شک ہو۔اگر کسی مسئلہ میں دل میں شک پیدا ہو جائے اور کتاب و سنت میں اس کا ذکر نہ ملے تو غور و فکر کر کے اس کی مثالوں کو دیکھو اور پھر قیاس سے کام لیتے ہوئے جو بات قرآن و سنت کے زیادہ قریب لگے اس کے مطابق فیصلہ دو۔فیصلہ کرتے ہوئے تنگ دلی کا مظاہرہ نہ کرو۔فریقین کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچاؤ۔مقدمہ کے پیش ہونے کے وقت بد خلقی کا مظاہرہ نہ کرو۔مقدمہ کا درست فیصلہ کرنے پر اللہ کے ہاں سے اجر ملے گا۔جو شخص درست فیصلہ کرے خواہ اپنے عزیز و اقارب کے خلاف کیوں نہ ہو اللہ اس کا کفیل بنے گا۔جو شخص انصاف کی راہ سے بھٹک گیا اور ایسا فیصلہ کیا جس پر اس کا اپنا دل مطمئن نہیں تو ایسے شخص کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔اللہ اپنے بندوں کو اس صورت میں ثواب دے گا جب وہ اخلاص نیت کے ساتھ اپنے کام سر انجام دیں"۔[19] اس خط کی اہمیت کے بارے میں علامہ ابن قیم رقمطراز ہیں۔"یہ وہ عمدہ خط ہے جس کو علماء نے تلقی بالقبول کی صفت سے نوازا ہے۔اور اس کی بنیاد پر قضاء اور گواہی کے اصول مرتب کئے ہیں حاکم اور مفتی اس خط کی مندرجات پر تامل اور تفقہ کے زیادہ حاجت مند ہیں"۔[20] اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک مکتوب جو آپ نے والی مصر کو لکھا تھا جس میں اس کو قاضی کے مقرر کرنے کا اختیار سونپا تھا اور یہ بھی فرمایا تھا کہ اس قاضی کو کن صفات کا حامل ہونا ضروری ہے۔اس میں آپ نے بہت اہم نکات کی طرف اشارہ کیا۔آپ نے فرمایا: "مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے رعایا میں سب سے زیادہ بہتر شخص کو مقرر کرو تاکہ تصفیہ میں دقت بھی نہ ہو اور فریقین کو اس کی خوشامد کرنے کی ضرورت بھی نہ پڑے۔جو غلطی پر نہ ڈٹا رہے اور ہر حال میں حق و سچائی کا دامن پکڑے رکھے۔جس کا نفس لالچ کی طرف مائل نہ ہو۔جو سرسری طور پر مقدمات کی سماعت نہ کرے بلکہ مکمل توجہ سے فریقین کے دلائل سنے۔ہر قسم کے معاملات پر نہ صرف گہری نظر رکھے بلکہ شبہ کے مواقع سے بھی واقف ہو اور جہاں ایسی صورت پیش آئے تو خوب غور و فکر سے کام لیتے ہوئے نتیجہ پر پہنچ جائے تو اسے قوت کے ساتھ نافذ کرے اور اس میں تاخیر نہ برتے۔سفارش اور لالچ کو فیصلوں پر اثر انداز نہ ہونے دیں۔جس شخص کو قاضی کے عہدے پر فائز کرو اس کی اتنی تنخواہ مقرر کرو کہ اس کو اپنے حوائج کے لیے رشوت لینے کی ضرورت نہ پڑے۔تمہارے دل میں اور مجلس میں اس شخص کی اتنی وقعت ہونی چاہئے کہ کوئی دوسرا شخص اس کے خلاف تمہارے دل میں بات نہ پیدا کر سکے"۔[21]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں قاضی کی تقرری نے ایک مستقل ادارے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ قاضی کو تمام بیرونی اثرات سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔اور قاضیوں کے مشاہرے بھی مقرر کئے گئے۔[22] حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے جاری کردہ اصول قضاء پر عمل ہوتا رہااور دار القضاء کے نام پر ایک عمارت بھی بنائی گئی جس میں عدل کے متعلق امور کو نمٹایا جاتا تھا۔[23]

اموی دور کے عدالتی نظام میں عادلانہ حق سماعت کا مفہوم

بنوامیہ کے دور میں قاضیوں کو صرف مسلمانوں کے مقدمات سننے کا حق تھا غیر مسلموں کے لیے علیحدہ سے جج مقرر تھے جو ان کے مذہب ورواج کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔[24] قاضیوں کی زیادہ تنخواہیں مقرر کی گئی تھیں تاکہ وہ خیانت کے مرتکب نہ ہوں۔ قضاء کے علاوہ او قاف کے مال کی نگرانی بھی قاضیوں کے ذمہ تھی۔اس میں اس محکمہ کو "صیغہ قضاء" کہا جاتا تھا۔اس دور میں "صیغہ قضاء" فرمانرواؤں کے اثر سے آزاد تھااور قاضی کی صفات میں تقویٰ، علم اجتہاد ،بلند کردار اور عیوب سے پاک ہونا ضروری تھا۔بنو عباس کے دور میں بھی قاضیوں کے وہی اختیار رہے۔ قاضی القضاۃ یعنی چیف جسٹس کے رعب کا یہ عالم تھا کہ امراءووزراء تو کجا خلیفہ کو بھی ان کے فیصلے سے سرتابی کی جراءت نہ ہوتی تھی۔ جہاں تک غیر مسلموں کے دیوانی مقدمات کا تعلق تھا وہ ان کے اپنے پیشواء اور ججز سنتے تھے لیکن فوجداری مقدمات میں سب کو بلا تفریق مذہب حکومت کے مقرر کردہ ججوں کے سامنے پیش ہونا پڑتا تھا۔اس دور میں اس حوالے سے نظام قضاء میں تبدیلی رونما ہوئی کہ ائمہ اربعہ کے مذاہب کے مطابق فیصلے دیئے جانے لگے جیسے عراق کے قاضی امام ابو حنیفہ کے مذہب کے مطابق فیصلے کرتے، شام اور بلاد مغرب کے قاضی امام مالک کے مذہب کے مطابق فیصلے کرتے۔ مصر والے امام شافعی کے مذہب کے مطابق۔ لیکن اگر مقدمہ کے فریق ایسے مذہب کے پیروکار ہوتے جو تمام طور پر اس شہر میں رائج نہ ہوتا تو قاضی کسی ایسے شخص کو اس مقدمہ کے فیصلہ کے لیے نائب مقرر کر دیتا جو انہی کے مذہب کا پیروکار ہوتا۔[25] عمر بن عبد العزیزؒ[26] نے قاضی کے انتخاب کے لیے جو پانچ صفات لازمی قرار دیں ان میں درج ذیل امور تھے:

قاضی کو تعیناتی سے قبل کے واقعات کا علم ہونا چاہیے۔

حرص سے نفرت رکھتا ہو۔

مستقل مزاج ہو اور مخالف کے ساتھ تحمل سے پیش آئے۔

ائمہ فقہ کا پیروکار ہو۔

اہل علم اور اصحاب رائے کے ساتھ میل ملاپ رکھنے والا ہو۔

لیکن اس دور میں قاضی کسی ایک مخصوص مکتبہ فکر کے امام کی پیروی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ جس کی رائے صائب معلوم ہوتی اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔[27]

عہد بنو عباس

بنو عباس کے دور میں تمدن کی وسعت کی بدولت نئی ضروریات زندگی میں بھی اضافہ ہوا نتیجۃ حصول مال کے لیے سارے وسائل اختیار کیے گئے۔ جو بالآخر تنازعات اور جھگڑوں کی صورت میں منتج ہوئے۔ تو ضرورت محسوس ہوئی کہ شہر میں قاضی مقرر کیے جائیں۔ اس مقصد کے پیش نظر بڑے شہر میں قاضی اور چھوٹے قصبوں میں ان قاضیوں کے نائب فیصلہ کرنے لگے۔ خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں تو یہ نظام اس قدر وسعت اختیار کر گیا کہ اس کی تنظیم کے لیے ایک محکمہ تشکیل دیا گیا اور ایران کے نظام عدالت کے طرز پر "قاضی القضاۃ" کا عہدہ بھی قائم کیا گیا اس کا کام ساری مملکت کے عدالتی نظام کی نگرانی کرنا تھا۔ عباسی دور میں یہ فتویٰ دیا گیا کہ فاسق شخص کو بھی قاضی مقرر کیا جا سکتا ہے اس کی نسبت حنفی فقہاء کی طرف کی جانے لگی جیسے ہدایہ میں مذکور ہے فاسق شخص قاضی بننے کا اہل ہے اگر اس کو یہ عہدہ دے دیا جائے تو درست ہے [28] لیکن اس کے بعد کے صفحہ پر یہ فتویٰ موجود ہے کہ امام شافعی فرماتے ہیں: فاسق کو قاضی بنانا درست نہیں جیسے کہ اس شخص کی گواہی بھی قبول نہیں ہوتی۔ اور ہمارے تینوں ائمہ امام ابو حنیفہ، امام محمد ابو یوسف اور امام محمد سے کتاب نوادر میں منقول ہے کہ فاسق کو قاضی بنانا درست نہیں۔ [29] عباسی دور حکومت میں ایک اور عدلیہ کا اصول متاثر ہوا وہ قانون کی نظر میں مساوات کا تھا۔ مسلم حکمرانوں کو ایسی مراعات دینے کے لیے فتوے جاری ہوئے جنھوں نے مساوات کے اہم اصول کو ختم کر دیا۔ ان کے مطابق مسلمان حکمران نہ صرف عدالت میں حاضری سے مستثنیٰ قرار پائے بلکہ شرعی سزاؤں سے بھی ماوراء قرار دیئے گئے۔ ان کی بنیادی وجہ عجمی تہذیب و تمدن کے اثرات تھے۔ وَكُلُّ شَيْءٍ صَنَعَهُ الْإِمَامُ الَّذِي لَيْسَ فَوْقَهُ إِمَامٌ فَلَا حَدَّ عَلَيْهِ إِلَّا الْقِصَاصُ فَإِنَّهُ يُؤْخَذُ بِهِ وَبِالْأَمْوَالِ [30]۔ "ایسا حکمران جس کے اوپر دوسرا اعلیٰ حکمران نا ہو اس پر جرم کے ارتکاب پر حد نہیں سوائے قصاص کے اور مال کے ضائع کرنے کے"۔ اسی دور میں قاضیوں کے دروازوں پر دربانوں کی تقرری کی گئی کیونکہ لوگوں کے ازدہام کی وجہ سے عدالتی نظام کو چلانا مشکل تھا اس کے موافق فتویٰ بھی موجود ہے۔ ابتداء قاضیوں کی تنخواہ زکوۃ کے مال سے ادا کی جاتی تھی۔ ابن رشد نے اس امر کو بیان کیا ہے کہ جو فقہاء شعبہ زکوۃ کے مالدار ملازم کے لیے زکوۃ میں سے تنخواہ کو جائز قرار دیتے ہیں وہ قاضیوں اور دیگر سرکاری ملازمین جن سے عام مسلمانوں کو فائدہ ہوتا ہے اس کے لیے بھی اس میں سے تنخواہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔ [31]

عہد بنو عباس میں قاضی القضاۃ/چیف جسٹس (Chief justice)

قاضی القضاۃ کا عہدہ سب سے پہلے عباسی دور حکومت میں امام ابو یوسف کو ملا جن کو ہارون الرشید نے اس عہدے پر فائز کیا۔ اور ان کے اختیارات اس قدر وسیع تھے کہ مختلف صوبوں جیسے شام، مصر، عراق اور دیگر اسلامی شہروں میں اس وقت تک کوئی شخص قاضی کے عہدے پر فائز نہ ہو سکتا تھا جب تک امام ابو یوسف اس کی تقرری کی منظوری نہ دے دیتے۔ تمام شرعی مسائل کے متعلق آخری فیصلہ کا اختیار ان کے پاس ہی تھا اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ قاضی القضاۃ جس مذہب کا پیروکار ہوتا منتخب کردہ دیگر بلاد کے قاضی بھی اسی فقہی مذہب کے پیروکار ہوتے۔ جس کے نتیجے میں پوری مملکت اسلامیہ میں عدالتی نظام میں مرکزیت پیدا ہو گئی اور مختلف علاقوں کے مختلف قاضیوں کا ایک ہی قسم کے تنازعہ میں مختلف فیصلوں کے نتیجے میں جو مسائل پیدا ہوئے تھے وہ ختم ہو گئے۔ لیکن یہ صورت حال

اس وقت تک رہی جب تک مرکزی حکومت کا خاتمہ نہ ہو گیا۔ شیرازہ منتشر ہونے کے بعد ہر علاقے کے امیر نے اپنے علاقے کے لیے قاضی مقرر کر لیے جن کا دارالخلافہ سے تعلق نہ ہوتا تھا۔ جب تک مرکزی حکومت کی کچھ شان برقرار رہی تو بغداد کے قاضی کو قاضی القضاۃ کے لقب کا مستحق سمجھا جاتا رہا۔ امام ابو یوسف کو چند وجوہ سے امتیازی خصوصیات کا حامل قاضی سمجھا جاتا تھا۔[32]

عہد عثمانی

بنو عباس کی حکومت چوتھی صدی ہجری کے آخر تک کسی نہ کسی طرح چلتی رہی لیکن پھر صوبوں کے تعلقات میں خرابی پیدا ہو گئی اور آہستہ آہستہ کئی صوبوں کے امراء نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اور عالم اسلام کا شیرازہ بکھر گیا مغلوں نے چنگیز خان کی سرکردگی میں اسلامی ممالک کا رخ کیا اور تھوڑے وقت میں ساحل چین سے بحیرہ روم تک حکمران ہو گئے۔ عباسی خلیفہ کا اکثر علاقوں میں خطبہ جمعہ میں نام لیا جاتا لیکن ہلاکو نے یہ سلسلہ بھی ختم کروا دیا اور اسلام کا عدالتی نظام تقریبا معطل ہو گیا۔ چنگیز خان کے کچھ وضع قوانین تھے جو "کاسہ" کہلاتے تھے اب ان کے مطابق عدالتوں میں فیصلے ہونے لگے۔ عباسی دور سے قبل جو قاضی مقرر کیے جاتے تھے ان سے یہ عہد لیا جاتا کہ جس چیز کی بابت نص موجود ہے اس میں صرف نص سے کام لیں اگر نہیں تو پھر ایسی رائے سے فیصلہ کریں جو نص کے زیادہ قریب ہو۔ اسپین میں اسلامی حکومت کے خاتمے کے بعد مختلف یورپی ممالک نے اسلامی دنیا کے زیادہ تر علاقے اپنے قبضے میں کر لیے۔ عثمانی حکومت کے پڑوس میں یورپ کے قوانین کی جدید طرز پر تدوین ہو رہی تھی تو بتقضائے زمانہ سلطنت عثمانیہ نے ایسے قوانین کا نفاذ ضروری جانا جو جدید زمانے کے تقاضوں کو پورا کرے لہٰذا مختلف یورپی ملکوں کے قوانین کا مطالعہ کیا گیا اور 1850ء میں فرانس کے قانون تجارت کو نافذ کیا گیا۔ 1857 میں قانون اراضی کو نافذ کیا گیا اور پھر فرانس کے قانون کے نمونے پر فوجداری قانون بنایا گیا۔ بعد ازاں اطالوی قانون زیادہ نافع لگا تو اس کے مطابق ترمیم کی گئی۔ 1861ء میں تجارتی عدالتوں کا اساسی قانون نافذ کیا گیا۔ 1868ء میں بحری تجارت کا، 1880ء میں دیوانی عدالت کا قانون وضع کیا گیا- 1911 میں اس کا تکملہ وضع کیا گیا۔ 1906ء میں قانون اجراء جاری کیا گیا۔ دیگر قوانین بھی وضع کیے گئے۔ جیسے صلح کا قانون، یتیموں کے مال کی بابت قانون، شرعی عدالتوں کے قانون اساسی وغیرہ وضع کیے گئے۔ عثمانی حکومت نے یہ کوشش کی کہ حتی الامکان دیوانی قوانین اسلامی شریعت کے مطابق ہوں اور عام عدالتوں میں انہی کے مطابق فیصلے کیے جائیں۔ چنانچہ محکمہ احکام عدلیہ کے ناظم احمد جودت پاشا کی قیادت میں علماء قانون کی مجلس قائم کی گئی جس کے ابتداء میں سات علماء رکن بنے[33] پھر اس میں کچھ تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ اس مجلس کا بنیادی مقصد فقہی مسائل کے حوالے سے ایسا مجموعہ قوانین مرتب کرنا تھا جو منظم بھی ہو اور سہل الماخذ بھی ہو اور اختلاف سے بھی پاک ہو۔ اور مفتیٰ بہ اقوال پر مشتمل ہو۔ اس غرض سے مجلۃ الاحکام العدلیہ کی تالیف ہوئی۔[34]

خلاصہ بحث:

عادلانہ حق سماعت کی اصطلاح عدالتی نظام میں نہایت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ملزم سے مجرم تک کا سفر طے کرنے والا وہ تمام مراحل طے کرتا ہے جن پر عادلانہ حق سماعت محیط ہے۔ اس اصطلاح کی لغوی تحقیق پر عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں

تفصیلات موجود ہیں جبکہ اس کی جامع اصطلاحی تعریف نہ تو شریعہ کے لٹریچر میں ملتی ہے اور نہ ہی بین الاقوامی قانون برائے انسانی حقوق کی دستاویزات میں۔ البتہ اس حق کے نتیجے میں ملنے والی ضمانتوں کی بابت مکمل تفصیلات شریعہ اور بین الاقوامی قانون میں موجود ہیں۔ اور اسلامی نظام عدل میں اس حق کو فوقیت اس اعتبار سے حاصل ہے کہ ملزم کے جملہ حقوق کا تحفظ نا صرف اسلامی تعلیمات کا حصہ ہیں بلکہ ہر دور بشمول عہد نبوی میں اس حق کی فراہمی کی عملی صورتیں بھی سامنے آئیں۔

حوالہ جات

[1]۔اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی قتل ہو جائے اور قاتل کے بارے میں واضح ثبوت نا ملیں تو جائے وقوعہ کے آس پاس پچاس لوگوں سے حلف لیا جائے کہ وہ اس قتل کے بارے میں نہیں جانتے۔ اسی طرح آپ ﷺ کے سامنے بھی ایک ایسا مقدمہ ایک انصاری کے قتل کے بارے میں پیش کیا گیا جس میں انصار نے اس قتل کا الزام خیبر کے یہود پر لگایا تھا۔ آپ ﷺ نے اس جائے وقوع کے ارد گرد کے پچاس لوگوں سے اس قتل کی بابت قسمیں اٹھوائیں تھیں۔

[2]۔ قبل از اسلام عرب کسی دوسرے کے بچے کو گود لے کر حقیقی بیٹے کا درجہ دے دیتے اور وراثت میں باقاعدہ حصہ بھی دیتے تھے۔

[3]۔ پتھر یا کنکری پھینک کر بیع کرنا۔

[4]۔ چھو کر بیع کرنا۔

[5]۔ مصری، احمد امین، فجر الاسلام، مصر: مؤسسۃ ہنداوی للتعلیم والثقافۃ، ص249۔

Misri, Ahmad Amin, Fajrul-Islam, Muasisatu Hindāwī lil-Taʿlīm was-saqāfa, p. 249.

[6]۔ شق اور سطیح نامی دو کاہن زمانہ جاہلیت میں کافی شہرت رکھتے تھے۔

[7]۔ اہل قریش نے عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہو کر یہ عہد کیا تھا کہ مکہ مکرمہ میں جب کسی پر ظلم ہو تو اس کی تلافی کی جائے نا کسی پر ظلم کرنے دیا جائے اور مظلوم کا حق دلوایا جائے یہ حلف الفضول کہلاتا تھا۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ اگر مجھے اس حوالے سے پکارا جائے تو میں جواب دوں گا اور اس کے بر خلاف سرخ اونٹ بھی قبول نہیں کروں گا۔ اگرچہ یہ زمانہ جاہلیت کا معاہدہ تھا لیکن رسول اللہ ﷺ کی تائید سے اس کو فعل نبوی اور شرعی امر کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

[8] Hasting, The Encyclopedia of Religion and Ethics, Vol, 11, p.185.

[9]۔ الاعراف: ۲۹، المائدہ: ۴۲۔

Al-Aʿrāf: 29, Al-Mā'ida: 42.

[10]۔ حضرت علی اور حضرت معاذ بن جبل کو آپ نے گورنر بنا کر بھیجا تھا۔

[11]۔ ترمذی، محمد بن عیسی، سنن الترمذی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، الدیات، باب ماجآء فی الحبس فی التھمۃ، رقم الحدیث: ۱۴۱۷۔

Tirmizi, Muhammad bin ʿEsa al-Tirmizi, Sunnan-al-Tirmizi, Dār-iḥya' al-turath-al-Arabi, Beirut, Hadith:1417.

[12]۔ ڈاکٹر حمید اللہ، اسلام کا نظام عدل گستری"، نگارشاتِ ڈاکٹر حمید اللہؒ، ج دوم، ص287۔

Dr. Hamidullah, Islam ka Nizām-e-ʿAdl-Gastarī, Nigārishāt-e-Dr. Hamidullah, vol. 2, p. 287

[13]۔ ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم قاضی، کتاب الخراج، المکتبۃ الازھریہ للتراث، س ن، ص192۔

Abu-Yusuf, Yaʿqūb bin Ibrahim, Kitāb ul-Khirāj, Al-Maktabt ul-Azharia lil-Turāth, p. 192.

[14]۔ کتانی، محمد عبدالحیؒ ،التراتیب الادار یہ، دار الارقم، بیروت، ج1، ص112۔

Kattānī, Muhammad Abdul-Ḥayei, al-tarātīb-al-Idāreya , Dār ul-Arqam, Beirut, vol. 1, p.112.
Muslehuddin: Judicial System of Islam: P:97

[15]۔ أبوداؤد، سلیمان بن الأشعث، سنن أبي داود، بیروت: دار الکتاب العربي،باب القود من الضربة وقص الامير من نفسه،رقم الحدیث:۴۵۳۶۔

Al-Sijistāni, Abu-Dāūd Suleman bin Ashʿas,-Sunnan abi- Dāūd, Beirut: Dār ul-Kitāb-al-Arabi, Hadith: 4536.

[16]۔ ایضا: رقم الحدیث: ۵۲۲۴۔

Ibid: 5224

[17]۔ ابن عرنوس، محمود بن محمد، تاریخ القضاء في الاسلام، القاهرة: المطبعة المصرية الأهلية الحديثة، 1934، ص25۔

Ibn-e-ʿurnūs, Mehmood bin Muhammad, Tārīkh ul- Qaza-fil-Islam, Cairo: al- Matbaʿt ul-misrea, al-ahlea-al-ḥadeesa, 1934, p.25.

[18]۔ الجوزیۃ، محمد بن ابی بکر ایوب الزرعی ابن قیم، اعلام الموقعین عن رب العالمین، بیروت: دار الجیل، 1973۔ ج1 ص85۔

Al-Jauzia, Muhammad bin abi Bakar, Ibn-e-Qayyam, Aʿlām-ul-Muwaqqiʿīn ʿan-Rabil- ʿAlamīn, Beirut: Dār-ul-Jeel, 1973, vol. 1, p.85.

[19]۔ ایضاً۔

Ibid.

[20]۔ ایضا، ج1 ص86۔

Ibid:1/86

[21]۔ البغدادی، أحمد بن علی أبو بکر الخطیب، تاریخ بغداد، بیروت: دار الکتب العلمیة ، ج14 ص103۔

Al-Baghdādi, Ahmad bin Ali, Abu-Bakar, al-Khatīb, Tāreekh-e-Baghdād, Beirut: Dār ul- kutub-al-ʿIlmiya, vol. 14, p. 103.

[22]۔ راشد شعیب، اسلامی نظام حکومت، اسلام آباد: بک پروموٹرز، 1995ء۔ ص188۔

Rashid Shoaib, Islami Nizam-e-Ḥakūmat, Islamabad: Book Promoters, 1995, p. 188.

[23]۔ محمد، حمید اللہ، عہد نبوی ﷺ میں نظام حکمرانی، حیدر آباد: مکتبہ ابراہیمیہ دکن، 1949ء۔ ص35۔

Muhammad, Hamidullah, ʿahd-e-Nabawi may Nizām-e-Ḥukumrāni, Hyderabad: Maktaba Ibrahimia, Dakkan, 1949, p. 35.

[24]۔ حمید الدین، ڈاکٹر، تاریخ اسلامی، کراچی: فیروز سنز لمیٹڈ، ص276۔

Hamid-uddin, Tārīkh Islami, Karachi: Feroz sons Limited, p. 276.

[25]۔ حسن ابراہیم، مسلمانوں کا نظم مملکت، مترجم علیم اللہ صدیقی، کراچی: دار الاشاعت، فریدی بک سنٹر، ص282۔

Hassan Ibrahim, Musalmāno-ka- nazm-e-mamlikat, Karachi: Dār ul-Ishāʿt, Fareedi book center, p.282

[26]۔ عمر بن عبدالعزیز پہلے شخص تھے جنہوں نے مظالم کے واقعات کے خود فیصلے کر کے حقداروں کو حق دلوائے۔ عہد خلفائے بنو عباس میں بھی مہدی، ہارون الرشید، مامون، مہدی دادرسی کے لیے دربار لگائے تھے۔ فارس کے بادشاہ بھی دادرسی کو اہمیت دیتے تھے اور مظالم کی دادرسی کے لیے ملکی قوانین اور آئین کا حصہ مقرر کرتے تھے۔

[27]۔ عمر بن عبدالعزیز کے دور میں قاضی اہم معاملات میں ان کی رائے معلوم کرتے تھے۔ جیسے ایک مرتبہ مصر کے قاضی عیاض نے ان کو لکھا کہ پہلے تو حق شفعہ قریب کے پڑوسی کو ملتا تھا اگر وہ نالینا چاہے تو جو اس سے قریب ہو۔ اب موجودہ حالات میں کیا کرنا چاہیے انہوں نے لکھا اب شفعہ کا حق صرف شریک کو حاصل ہے۔ لوگوں نے اپنی زمینوں اور گھروں میں داخلہ کے لیے جدا جدا راستے بنا لیے تو پھر حق شفعہ کیوں دیا جائے۔ (تاریخ کندی)

[28]۔ابن الھمام، کمال الدین، محمد بن عبدالواحد السیواسی، فتح القدیر، کتاب ادب القاضی، بیروت: دار الفکر۔ ج5ص454۔
Ibn-e-Hummam, Kamal-ud-din, Muhammad bin Wahid, Sharḥ Fatḥ ul-Qadīr, Kitāb-adb-ul-Qāzi, Beirut: Dār ul-Fikar, vol. 5, p. 454.

[29]۔ایضا۔ ص455۔

Ibid: 455

[30]۔ایضاً، ج11ص480۔

Ibid, vol. 11, p. 480.

[31]۔القرطبیّ، ابن رشد، أبوالولید محمد بن أحمد بن محمد، بدایۃ المجتھد و نھایۃ المقتصد، مصر: مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی و أولادہ، 1975م۔ ج1ص276۔
Al-Qurtabi, Ibne-rushd, abu al -Waleed, Muhammad bin Ahmad, Bidāyat ul-Mujtahid-wa-nihāyat ul-Muqtasid, Egypt: Maktaba Mustafa,1975,vol. 1, p. 276.

[32]۔ قاضی القضاۃ کا لقب جس کو چیف جسٹس کہا جاتا ہے سب سے پہلے امام ابو یوسف کے لیے استعمال ہوا۔ انہوں نے سب سے پہلے علماء و غیر علماء کے لباس میں امتیاز کے لیے سرکاری طور پر علماء کے لیے خاص لباس ضروری قرار دیا جس کو غیر عالم نہیں پہن سکتا تھا۔

[33]۔ان میں احمد خلوصی، احمد حلمی ممبر، محمد امین جندی، سیف الدین ممبر مجلس شوریٰ، سید خلیل، محمد علاءالدین بن عابدین شامل تھے۔

[34]۔اس مجلس نے محرم 1286ھ بمطابق 1869ء میں جو رپورٹ عثمانی حکومت کے صدر عالی پاشا کو پیش کی اس میں "مجلۃ الاحکام العدلیہ" کی غرض یہ بیان کی گئی کہ فقہ تو ایک سمندر ہے جس کی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے علم و مہارت دونوں کی ضرورت ہے بالخصوص حنفی فقہ میں بہت سے مجتہد ہوئے جن میں باہمی اختلاف بھی موجود ہے۔ان کے مسائل ایسے منتشر ہیں کہ اس میں سے صحیح قول کا پہچاننا اور ان کی مختلف حالات پر تطبیق دشوار امر ہے۔ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ معاشرے کے وہ مسائل تبدیل ہوتے ہیں جن کی بنیاد عرف ورواج پر ہوتی ہے۔اس مجلس نے 1869ء میں سال بھر قانون سازی کا کام کیا اور مجلہ کا مقدمہ اور باب اول کا کام ضروری اصطلاحات و ترمیمات کے ساتھ پیش کیا۔ پھر اراکین مجلس نے کام آپس میں تقسیم کر لیا 1876ء میں اس کی تالیف مکمل ہو گئی اس کو "مجلۃ الاحکام العدلیہ" کے نام سے چھاپا گیا۔اس کے سولہ ابواب ہیں اور 1851 دفعات ہیں۔ایک مقدمہ میں سو دفعات ہیں پہلی دفعہ میں علم فقہ کی تعریف کی گئی اور اقسام بیان کی گئی ہیں۔اور دیگر میں عام قواعد کا ذکر ہے۔اس کا سولھواں باب "کتاب القضاء" پر مشتمل ہے اس کے اکثری احکام حنفی کتب فقہ ظاہر الروایۃ یعنی بنیادی کتب سے ماخوذ ہیں جس مسئلہ میں امام ابو حنیفہ اور صاحبین کا اختلاف ہو وہاں وہ مسلک اختیار کیا گیا جو زمانہ کے تقاضے اور مصلحت عامہ کے اعتبار سے انفع ہے۔ جیسے "سفیہ" کی بیع کے بارے میں امام ابو حنیفہ عدم نفاذ کے قائل ہیں اور صاحبین نفاذ کے قائل ہیں تو مجلہ میں صاحبین کے قول کو اختیار کیا گیا ہے۔ چند ایسے مسائل ہیں جن میں ظاہر الروایہ کو چھوڑ کر دیگر روایات کو اختیار کیا گیا ہے جیسے غصب کردہ چیزوں کے منافع کی ادائیگی کے وجوب میں حنفی فقہ کے بعد ان فقہاء کی رائے کو اختیار کیا گیا جو شافعی فقہ کے قریب ہیں۔اس دور میں قاضی کا عہدہ لوگوں کے لیے زیادہ پر کشش نا رہا تھا۔اور اس عہدے پر فائز ہونے والے کو کچھ زیادہ وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا لیکن کچھ ایسے قاضی بھی گزرے اس دور میں جو اپنی حق گوئی کی وجہ سے لوگوں میں خوب وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ جیسے قاضی ابن خلقان نے دس سال تک قضاء کا عہدہ نبھایا تھا جب ان کو معزول کر دیا گیا تو شام سے مصر چلے گئے لیکن شام کے لوگوں نے حکومت پر دباؤ ڈال کر ان کو دوبارہ بلا کر اسی عہدے پر بحال کروادیا۔ مجلہ الاحکام العدلیہ تقریبا ان تمام ملکوں میں قبول کیا گیا جو اس زمانہ میں ترکوں کے زیر اقتدار تھے اس وقت سے لے کر پہلی جنگ عظیم کے بعد تک یہ ان تمام ملکوں میں نافذ رہا لیکن پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر سب سے پہلے ترکی میں یہ ختم ہوا اس کی جگہ جرمنی، اٹلی، سوئزر لینڈ کے قوانین کو جگہ دی گئی اور البانیہ میں بھی اس کو ختم کر دیا گیا۔